

ترکی میں اسلام اور سیکولر ازم کی کشمکش

(حالیہ انقلاب سے پہلے تک)

جناب خلیل احمد حامدی

ترکی کی اسلامی تحریک کے بارے میں کچھ بیان کرنے سے پہلے خود ترکی کے بارے میں چند بنیادی حقائق جان لینا مفید رہے گا۔

تاریخی پس منظر | ترکی کا موجودہ رقبہ ۷۷ لاکھ ۸۰ ہزار ۵ سو ۶ مربع کلومیٹر ہے اور آبادی ۳۳ ملین یعنی کم کر ڈر ۳۰ لاکھ افراد۔ اس میں ۹۸.۹ فیصد مسلمان ہیں اور ۱.۱ فیصد دیگر اقلیتیں مثلاً یہودی، ارتھوڈوکس، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ چرچ کے پیروکار۔

ترکی کے موجودہ علاقے کو ماضی میں ایشیائے کوچک کہا جاتا تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں اس کے کچھ حصے مسلمانوں نے فتح کر لیے۔ ۱۰۷۱ء میں سلجوقی سلطان الپ ارسلان نے ملازکرو میں بازنطینی حکمران کو شکست دے کر اس علاقے میں مسلمانوں کی طاقت میں مزید اضافہ کر دیا۔ لیکن مسلمانوں کی مکمل سلطنت اس علاقے میں ۱۲۸۸ء میں قائم ہوئی جس کا بانی عثمان بن ارطغرل تھا۔ اس لیے تاریخ میں اسے سلطنت عثمانیہ کہا جاتا ہے۔ عثمانی حکمرانوں کی شجاعت اور دینی حمیت کی بدولت یہ سلطنت مسلسل ترقی پذیر رہی۔ ۱۵۲۰ء سے لے کر ۱۵۶۶ء تک کا زمانہ اس سلطنت کا دورِ عروج کہلاتا ہے۔ یہ سلطان سلیمان قانونی کا دورِ حکومت تھا۔ اس دور میں سلطنت عثمانیہ روس کے جنوب ایشیائے کوچک، عراق اور خلیج عربی سے لے کر شمالی افریقہ میں مراکش کی حدوں تک پھیل گئی عثمانیوں نے دو مرتبہ (۱۵۲۹ء اور ۱۶۸۳ء میں) یورپ کے اندر ویانا کے راستے پیش قدمی کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ویانا کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آتے رہے۔ اگر عثمانی سلاطین یورپ میں

داخلہ میں کامیاب ہو جاتے تو اب دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

ایک طرف یورپ کی صلیبی طاقتوں کے ساتھ سلطنت عثمانیہ برسرِ پیکار رہی۔ اور دوسری طرف ۱۷ویں اور ۱۸ویں پوری دو صدیوں میں روس کے ساتھ ترکی کی طویل جنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ دونوں طاقتیں سلطنت عثمانیہ کو مٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا نذر لگاتی رہیں۔ آخر کار سلطنت ۱۹ویں صدی کے وسط سے کمزور ہونا شروع ہوئی۔ بیرونی دشمنوں کی سازشوں اور چہرہ دستیوں کے ساتھ ساتھ اب اندرونی طور پر بھی ایسے اسباب مہیا ہو گئے جنہوں نے سلطنت کی جڑیں ہلا دیں۔ اور پچیسویں صدی کے آغاز میں بیرونی اور اندرونی دونوں طرف کے دشمنانِ اسلام کو مصطفیٰ کمال پاشا کی شکل میں ایک ایسا شخص مل گیا، جس نے ان کی آرزوؤں کو پورا کر دیا۔ کمال اتاترک نے ۱۹۲۴ء میں عثمانی سلطنت کو ختم کر دیا۔ اور اس کے بعد ترک کی نہایت تاریک دور میں داخل ہو گیا۔ ۱۹۳۸ء میں کمال اتاترک کی وفات تک پورے ۴۴ سال ترک کی لادین آمریت کے شکنجے میں گرفتار رہا۔ کمال اتاترک کے مرنے کے بعد عصمت انونو حکمرانی کی منہ پر بیٹھا اور ۱۹۵۰ء تک اس نے فوجی حربوں کی مار سے حکومت کی اور اس پالیسی کو پوری طاقت کے ساتھ برقرار رکھا جو اس کے پیش رو نے تجویز کی تھی۔ لیکن ۱۹۵۰ء میں عصمت انونو کے ماتھے سے اقتدار نکل گیا۔ اور پھر اسی وقت سے ترکی میں واحد حکمران پارٹی کے علاوہ دوسری پارٹیاں بھی وجود میں آ گئیں۔ اور ترک کی سیاست میں ایک نئی تبدیلی کا آغاز ہو گیا۔

مصطفیٰ کمال پاشا کی "اصلاحات" مصطفیٰ کمال پاشا اور اس کے ساتھیوں نے ترک کی کے اندر اسلامی خلافت کو ختم کرنے کے بعد جو کچھ وہاں کیا وہ ایک طویل بحث ہے۔ اس کا خلاصہ میں مستقبل کے مائتد اسلامک انسٹی ٹیوٹ میں فقر کے پروفیسر خیر الدین قرہ مان کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔

”ترک کی قوم کو اس کے ماضی سے کاٹ دیا گیا۔ اسے مادہ پرست، قوم پرست

اور مغربی تہذیب کی دلدادہ قوم بنانے کی کوشش کی گئی۔ ترک کی کو ایک لادین ریاست

میں بدل دیا گیا۔ مذہب اور سیاست کو جدا جدا کر دیا گیا۔ مذہب کو انسان کا ذاتی مسئلہ

قرار دیا گیا۔ اور ہر فرد کو یہ اجازت دے دی گئی کہ وہ جو مذہب چاہے اختیار کر سکتا

ہے۔ خلافت کا ادارہ منسوخ کر دیا گیا، شرعی قوانین اور اسلامی عدالتیں ختم کر دی گئیں۔

شرعی قوانین کے بجائے یورپی قوانین درآمد کیے گئے۔ سوئٹزرلینڈ سے دیوانی قانون اٹلی سے فوجداری قوانین اور جرمنی سے تجارتی قانون درآمد کیا گیا۔ احوالی شخصیت یعنی نکاح و طلاق اور وراثت و وصیت کے معاملات یورپ کے دیوانی قانون کے تابع کر دیے گئے۔ دینی تعلیم پر پابندی لگا دی گئی اور دینی تعلیم کے ادارے مقفل کر دیے گئے۔ عورت کے لیے پردہ ممنوع اور بے پردگی لازم قرار دی گئی۔ تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم کا نظام جاری کیا گیا۔ عربی رسم الخط منسوخ کر کے لاطینی رسم الخط نافذ کیا گیا۔ عربی زبان میں اذان روک دی گئی۔ لباس بدل دیا گیا۔ پتلون اور مہیٹ کا استعمال لازم ٹھہرایا گیا۔

(بحوالہ مہفت روزہ الدعوة۔ ریاض شمارہ ۲۵ / فروری ۱۹۸۱ء)

نوری تحریک | اس دورِ ظلمت میں حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے کئی خدا کے بندے اٹھے اور جان کا نذرانہ پیش کرتے رہے۔ ان میں نمایاں شخصیت علامہ بدیع الزمان سعید نوری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ موصوف ۱۸۴۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۶۰ء میں فوت ہوئے۔ گویا انہوں نے ترکی کا پورا دورِ زوال اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ خلافت اُن کے سامنے ختم ہوئی۔ علمائے حق ان کی آنکھوں کے سامنے جامِ شہادت نوش کرتے رہے یا تہذیب کی مچھلی میں جھونکے جاتے رہے۔ لادینیت کا دیواستبداد اُن کے سامنے پا کو بی کہہ تارڑا۔ اس دورِ پُر آشوب میں انہوں نے اسلام کی دعوت کا فریضہ سنبھالا۔ انہوں نے مغربی تہذیب کی فکری یلغار کے سامنے اسلام کے بنیادی عقائد کی اشاعت پر زور دیا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے مضامین قلمبند کرتے اور پھر اپنے شاگردوں کے ذریعے ان کی دستی کاپیاں تیار کر کے عام لوگوں کے اندر خفیہ طور سے پھیلاتے۔ یہ سلسلہ انہوں نے اس منظم اور خاموش طریقے سے جاری کیا کہ پیشتر اس کے کہ ترکی کے لادین حکمرانوں کو اس کی خبر ہو، اُن کی دعوت ہزاروں نوجوانوں تک پہنچ گئی۔ ان مضامین کو ”رسائلِ نور“ کا عنوان دیا گیا۔ ان کی تعداد سو سے متجاوز ہے۔ اور یہ دست بدست ملک کے اندر پھیل رہے تھے۔

جب حکومت کو ان رسائل کا علم ہوا تو وہ بڑی جہد بزد ہوئی۔ چنانچہ علامہ بدیع الزمان نوری اور اُن کے شاگردوں کے خلاف حکومت حرکت میں آگئی۔ اور شدت کے ساتھ اُن کی پکڑا دھکڑا کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ علامہ مرحوم کی زیادہ تر زندگی جیل کی سلاخوں کے اندر گزری۔ بارہا اُن پر مہم

قائم کیے اور ان پر الزام صرف یہ تھا کہ وہ ایک لادین ریاست کے اندر اسلام کا پرچار کرتے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں ملک میں امن عامہ کو نقصان پہنچتا ہے۔ ایک مرتبہ مرحوم نے ترکی عدالت کے سامنے اپنا دفاع کرتے ہوئے فرمایا:

”کوئی بھی تحریک خواہ وہ کتنی ہی پھیل جائے حکومت کے سقوط تک نہیں پہنچ سکتی۔ ماچس کی ایک تیلی سے اگرچہ ایک عمارت تدر آتش کی جاسکتی ہے۔ لیکن کیا یہ معقول بات ہوگی کہ جس کے پاس بھی وہ تیلی ہو، وہ مجرم ہے خواہ وہ عمارت کو جلانے کا ارادہ رکھتا ہو یا نہ۔ وکیل استغاثہ نے یہ الزام بھی لگایا ہے کہ رسائل نور اس حد تک پھیل چکے ہیں کہ کم از کم اناضول کے اندر ۶ لاکھ انسان انہیں پڑھ چکے ہیں۔ ان میں سے اساتذہ بھی ہیں اور کسان بھی۔ طلباء بھی ہیں اور سرکاری ملازمین بھی۔ تو اس میں کیا حرج ہے؟ کیا ان رسائل کے مطالعہ کے بعد کسی شخص نے اپنے فرائض میں کوتاہی کی ہے؟ یا اس کی قومی سرگرمیوں میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے؟ یا ان میں سے کسی شخص کے ہاتھوں امن عامہ کو خطرہ لاحق ہوا ہے؟ یا اس نے ملکی دستور کی خلاف ورزی کی ہے؟ لہذا تم اس تعلیمی مشن کو بند کرنے کے لیے کیا جواز رکھتے ہو، جس کی جرأتیں لاکھوں ترک شہریوں کے دل میں اتر چکی ہیں؟“

”تمہارا یہ اعتراض بھی ہے کہ ہماری یہ سرگرمیاں حکومت کی اجازت کے بغیر جاری ہیں۔ یعنی ہمارا فرض تھا کہ ہم حکومت کے محکمہ امور مذہبی سے لائسنس لے کر یہ کام کرتے۔ یعنی ہم اللہ کی عبادت اور اس کے رسول کی اطاعت کے لیے حکومت سے لائسنس لیتے؟ مجھے پر یہ اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ سرکاری احکام کے باوجود میں نے دوسری ٹوپی ترک کر کے ہیٹ نہیں پہنا۔ اور اسی حالت میں عدالت میں آگیا ہوں، اس سے عدالت کی توہین ہوتی ہے۔ لیکن آپ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ ملک کے اندر ان لوگوں کی تعداد انتہائی کم ہے جنہوں نے خوشذلی کے ساتھ عامہ چھوڑ کر یورپی ہیٹ اوڑھا ہے آپ لوگوں کا مسلمانوں کے ساتھ تو یہ ناروا سلوک ہے اور دوسری طرف فری میسن اور دوسرے ان کے ہم مشرب لوگوں کو اس امر کی کھلی جھپٹی ملی ہوئی ہے کہ وہ اسلام کا

جس قدر شرمناک طریقے سے تسخر اڑانا چاہیں اڑالیں۔ اور جس حد تک چاہیں لوگوں کے اندر شراب، زنا اور جھوٹے کوہِ راج دیں اور مجھے اتنی بھی اجازت نہ ہو کہ میں لوگوں کو قرآن سنائوں اور انہیں اللہ کی طرف دعوت دوں۔“

مرحوم کو عمر کے آخری حصے میں ایک بار پھر گرفتار کر کے عدالت کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس مرتبہ بھی اُن پر الزام یہ عاید کیا گیا تھا کہ وہ امن شکنی کے مرتکب ہوئے ہیں اور اقتدار کے بھوکے ہیں۔ مرحوم نے اس الزام کا جواب دیتے ہوئے کہا:

”اے حکمران، تم سمجھتے ہو کہ میں کسی ذاتی منفعت کے لیے یہ تمام جدوجہد کر رہا ہوں۔ میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ دیکھو اسی سال کا بوڑھا انسان، جس کی ٹانگیں قبر میں ہیں۔ بے وسیلہ انسان جس کے پاس دنیا کی کوئی متاع نہیں ہے۔ نہ مکان اور نہ زمین۔ اس عمر میں میں کسی دنیاوی مفاد کو حاصل کر کے کیا کروں گا۔ میں نے اپنی زندگی میدانِ جہاد میں گزار دی ہے۔ جنگی قیدیوں کے کیمپوں میں مجھے برسوں تک محبوس رکھا گیا، کبھی جیل میں اور کبھی جلا وطنی میں بے بس و بے سہارا پڑا رہا۔ بستی بستی اور شہر شہر میرا تعاقب کیا گیا۔ معاشرے کے اندر تم لوگوں نے مجھے اچھوت بنا کر رکھ دیا۔ تم لوگوں نے مجھے رشتہ داروں اور دوستوں سے ملنے سے بھی محروم رکھا۔ اگر میرے اندر ایمان و احتساب کی طاقت نہ ہوتی جو ہمیشہ مجھے مایوسی کی تاریکیوں سے نکالتی رہی ہے تو میں اس مکدر زندگی پر موت کو ترجیح دیتا۔ لیکن ان آلام و مصائب سے چمکنا زندگی کے باوجود میں نے یہ رسائل تحریر کیے ہیں اور الحمد للہ ان رسائل سے ۵ لاکھ سے زیادہ انسانوں نے استفادہ کیا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کا ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے اپنی قوم کی خاطر یہ قربانی دینے کی توفیق عطا فرمائی۔“

جماعتِ نور اور دوسرے چند اسلامی گروپ سیاست سے کنارہ کش ہو کر جوانوں کی فکری اور اخلاقی تربیت میں لگے رہے۔ سیاست سے ان کی کنارہ کشی اسلام کے جامع تصور سے ناواقفیت کی بنا پر نہ تھی۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ اُن کا سامنا ایک نہایت بے رحم اور ظالم و جابر حکومت سے تھا، جس نے ملک کے اندر الحاد اور بے دینی کو فروغ دینے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے اختیار

کر رکھے تھے۔ اور ترک نوجوان ان سے متاثر اور مرعوب ہو رہے تھے، اسی لیے بدیع الزمان نورسی مرحوم اور ان کے شاگرد تعلیم و تربیت کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ خود بدیع الزمان نورسی مرحوم کا ابتدائی دور سیاسی سرگرمیوں سے چھ نظر آتا ہے۔ وہ اقتدار کے خلاف بڑی جرأت کے ساتھ برسرِ پیکار رہے ہیں اور بڑے بڑے سیاسی محرکے انہوں نے سرانجام دیے ہیں۔ کئی مرتبہ انہیں موت کی سزا سنائی گئی۔ بلکہ ان کے بیسیوں ساتھیوں کو بالفعل تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ وہ عزیمت کا پہاڑ تھے۔ لیکن آخر کار انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ حالات کے پیش نظر اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ نوجوانوں کے اندر ایمان و عقیدے کی پختگی کے ساتھ ان کی اخلاقی تربیت کی جائے تاکہ جب حالات میں کچھ تبدیلی ہو تو وہ پھر بھی نوجوان اسلام کے کامل احیاء کا علم ختم لیں۔ علامہ بدیع الزمان نورسی کی دور اندیشی کام آگئی۔ ترکی کی موجودہ اسلامی تحریک اسی نہری فارم سے تیار ہوئی ہے جس کی تخم ریزی اور آبیاری مرحوم کر گئے ہیں۔

جمہوری زندگی کا آغاز | یہ محض ترکی کی اسلامی تحریک کا ایک دور۔ دوسرا دور ۱۹۵۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن ہم اپنی بات کو ۱۹۵۰ء سے شروع کرنے کے بجائے اس دور کے عالمی حالات پر بھی نظر ڈالتے ہیں۔ کیونکہ ان عالمی حالات نے ہی درحقیقت ترکی کی اسلامی تحریک کو ایک نئے دور میں داخل کیا۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سٹالن نے ترکی کے سامنے چند نئے مطالبات رکھے۔ مثلاً روس کو آبنائے باسفورس استعمال کرنے کا حق دیا جائے۔ ترکی کے بعض صوبوں پر بھی سٹالن نے دعویٰ کر دیا۔ ترکی کی کمزور حکومت ان روسی مطالبات سے پریشان ہو گئی۔ اور اسے امریکی سیاست کے سامنے جھک کر اپنے بچاؤ کے لیے معاہدہ اطلانتک میں شامل ہونا پڑا۔ لیکن معاہدہ اطلانتک کے رکن ممالک نے اس وقت تک ترکی کی رکنیت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جب تک ترکی کے اندر جمہوری نظام قائم نہیں ہو جاتا۔ یعنی یک جماعتی آمرانہ نظام کے بجائے ایک سے زیادہ جماعتوں کا نظام۔

۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ معاہدہ اطلانتک کے رکن ممالک کا مقصد یہ تھا کہ انہیں یہ اطمینان ہو جائے کہ ترکی کا سیکولر نظام فی الواقع عوام کے جذبات کا آئینہ ہے۔ بلکہ ان کا خیال تھا کہ وہ ترکی

میں مغربی طرز کے جمہوری نظام کی بدولت ترکی کو مکمل طور پر سیکولر بنا دیں گے، اور ترکی صحیح معنوں میں یورپ کا ایک حصہ بن جائے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس شرمیں سے ترکی مسلمانوں کے لیے غیر کا پہلو برآ کر دیا۔

ترکی نے یہ مطالبہ مان لیا کہ وہ وہاں ایک مغربی نظام کے بجائے تعددِ احزاب کا نظام جاری ہو۔ ترکی کی حکمران جماعت ریپبلکن پارٹی کے صدر عصمت انونو صاحب کو یہ نیا نظام قبول کر لینے پر اس لیے کوئی تشویش نہ ہوئی کہ وہ سمجھتے تھے کہ ترکی میں لادینیت کی جڑیں خاصی مضبوط ہو چکی ہیں۔ اسلام کے بارے میں نفرت لہگوں کے دلوں میں رچ بس چکی ہے۔ اور مغربی طرزِ زندگی پر لوگ اس قدر فریفتہ ہو چکے ہیں کہ اب ان کے لیے اسلام کی طرف واپس آنا ناممکن ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ترکی میں جو اپوزیشن پارٹی بھی وجود میں آئے گی وہ ریپبلکن پارٹی کے بطن سے جنم لے گی اور یوں وہ ان تمام اوصاف کی حامل ہوگی جو خود ریپبلکن پارٹی کے اندر پاٹی جاتی ہیں۔ چنانچہ عصمت انونو نے کمال اتاترک ہی کے دور کے ایک وزیرِ بایار کو یہ مہم سپرد کی کہ وہ حزب مخالف تشکیل کریں۔ چنانچہ حکمران پارٹی ریپبلکن کے مقابلے میں جلال بایار نے ڈیموکریٹک پارٹی کی داغ بیل ڈالی۔ اس پارٹی میں جلال بایار کے بعد دوسری شخصیت عدنان مندریس کی تھی۔

اسلامی اصلاحات عدنان مندریس کے عہد میں | عدنان مندریس کا تعلق ترکی کے ایک مغرب گھرانے سے تھا۔ ان کے والد عالم دین تھے۔ خود عدنان مندریس عوام الناس کی نفسیات اور ان کے احساسات سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ وہ انہیں خطاب کرنا جانتے تھے۔ والد کی روح بھی ان کے اندر سرایت کیے ہوئے تھی۔ آگے چل کر وہ ڈیموکریٹک پارٹی کے لیے ایک دھماکہ خیز شخصیت ثابت ہوئے۔

نئے نظام کے تحت ۱۹۵۰ء میں پہلی مرتبہ ترکی میں انتخابات ہوئے۔ ڈیموکریٹک پارٹی ایک حیرت انگیز منشور لے کر انتخابات میں اتر گئی۔ امریکی مبصرین کے مطابق بنیاد پر حالات میں اس منشور کی ناکامی یقینی امر تھا۔ وہ منشور یہ تھا:-

۱۔ ترکی کے اندر عربی زبان میں اذان بجالا کر دی جائے گی۔

۲۔ ترکوں کو حج بیت اللہ کی اجازت دے دی جائے گی۔

۳۔ قرآن کریم کی تعلیم و تدریس پر پابندی ختم کر دی جائے گی۔

۴۔ ریاست عورت کے لباس کے معاملے میں کوئی دخل نہ دے گی۔

۵۔ ایاصوفیا کی مسجد و اگزارہ کر دیے جائے گی۔ (یہ مسجد پانچ سو سال سے چلی آ رہی تھی، جسے کمال پاشا نے میوزم میں بدل دیا تھا)۔

ایک ترک دانشور نے اس منشور پر دو پارٹیوں کو انتخابات میں شریک ہونے کی اجازت دیے جانے پر تبصرہ کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا ہے؟

”امریکی لیڈر دراصل یہ امتحان لینا چاہتے تھے کہ کمال ازم ترکی کے اسلامی جذبات کی بیخ کنی میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے لیکن اس امتحان کا نتیجہ ان کے لیے انتہائی حیران کن نکلا۔ کمال پاشا کی ری پبلکن پارٹی پہلے ہی مرحلے میں گر گئی۔ اسے پارلیمنٹ میں صرف ۳۲ نشستیں ملیں جب کہ ڈیموکریٹک پارٹی نے ۳۱۸ نشستیں جیت لیں۔“

عدنان مندریس کو کامیاب ہونے کے بعد اپنے وہ وعدے پورے کرنے پڑے جو اس نے انتخابی مہم کے دوران عوام سے کیے تھے۔ اس نے کابینہ کے پہلے اجلاس میں جو یکم رمضان کو منعقد ہوا ترکی عوام کو رمضان المبارک کا یہ تحضر پیش کر دیا کہ آج سے ترکی میں عربی زبان میں اذان ہوگی۔ لباس کی آزادی ہوگی، تعلیم قرآن کی آزادی ہوگی۔ اُن کے لیے حج بیت اللہ کا راستہ کھول دیا گیا ہے۔ عدنان مندریس نے بعض مساجد کی تعمیر بھی شروع کر دی۔ ایاصوفیا کو تو وہ و اگزارہ کر اسکا۔ البتہ اُس نے یہ اجازت دے دی کہ اُس کی ڈیوڑھی میں نماز ادا کی جاسکتی ہے۔ ترکی عوام کی خواہش کے مطابق ڈیموکریٹک پارٹی نے عرب ممالک کے ساتھ تعلقات کا آغاز بھی کر دیا۔

۱۹۵۲ء میں دوبارہ انتخابات ہوئے۔ اب ری پبلکن پارٹی کے اندر مزید تنزل آ گیا۔ اور اس کے صرف ۲۲ نمائندے کامیاب ہوئے۔ عدنان مندریس کی حکومت نے اس مرتبہ ایک قانون جاری کیا جس کی رو سے اُس نے وہ تمام مساجد واپس لے لیں جو مصطفیٰ کمال پاشا کے عہد میں لوگوں کو فروخت کر دی گئی تھیں نیز عدنان مندریس نے ۲۸ مدارس ائمہ و خطباء کھولے۔ تین دینی تعلیم کے اعلیٰ ادارے قائم کیے، اور سینکڑوں حفظ قرآن کے مکتب جاری کر دیے۔ عدنان مندریس اس قدر ذہین لیڈر تھا کہ جس علاقے کے اندر وہ محسوس کرتا کہ اُس کی مقبولیت کم ہوتی جا رہی ہے تو وہ عوام کے دل جیتنے کے لیے وہاں کسی مسجد

کا افتتاح کر دیتا۔ عصمت النور نے ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کو تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن عدنان مندریس نے عرب دوستی کی پالیسی اختیار کی۔ اس نے اسرائیلی مصنوعات کی درآمد پر پابندی لگا دی۔ اور ۱۹۵۶ء میں اس نے اسرائیلی سفیر کو ترکی سے نکال دیا۔ عدنان مندریس نے پہلی مرتبہ ترکی کے اندر صنعت قائم کرنے کا بھی آغاز کیا۔ گو یہ آغاز غیر ملکی سرمایہ کے بل بوتے پر تھا۔

جمال گورسل کا فوجی انقلاب | ترکی فوج کے افسران نے محسوس کیا کہ اگر عدنان مندریس کی حکومت قائم رہی تو مصطفیٰ کمال پاشا کے لادینی اصول بے اثر ہو کر رہ جائیں گے اور وہی اسلامی روح پھر عود کر آئے گی، جس سے انہوں نے چھسکارا حاصل کیا ہے۔ اس امر کا احساس نہ صرف فوجی افسران کو ہوا بلکہ مغربی طاقتوں نے بھی اس خطرے کو شدت سے بھانپ لیا۔ چنانچہ جمال گورسل کی قیادت میں ترکی فوج نے ۱۹۶۲ء میں انقلاب برپا کر دیا۔ عدنان مندریس اور ان کے ساتھیوں کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ ان میں وزیر خارجہ فطین بھی تھے جو ترک عرب اتحاد کے سرگرم حامی تھے۔

۱۹۶۰ء کا سال اسلامی تحریک کے لیے نہایت اہم سال ہے۔ کیونکہ اسلامی تحریک کی تاریخ میں یہ ایک نئے اور اہم دور کی کلید بن کر آیا۔ ترکی فوج جن عزائم اور منصوبوں کو لے کر آئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے وہ سب الٹ کر رکھ دیے۔ انقلابی حکمرانوں نے ایک طرف دنیا کو یہ تصور دینا چاہا کہ وہ جمہوریت اور انسانی آزادی کے خلاف نہیں ہیں۔ اور دوسری طرف انہوں نے عدنان مندریس کے دور میں اُبھر آنے والے اسلامی اثرات اور مسجد نور سی کی دعوت سے اُٹھنے والی کڑوں کو محو کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کی رو سے انہوں نے نیا قانون جاری کیا جس میں نشر و اشاعت کی آزادی دی گئی جو اس سے پہلے بالکل مفقود تھی۔ اس آزادی سے اُن کے پیش نظر بائیں بازو کے عناصر کو یہ موقع فراہم کرنا تھا کہ وہ ملحدانہ اور گمراہ کن طریقے کے ذریعے ملک کے اندر ایسی فکری تحریک برپا کریں جو اسلامی بیداری کی ہر علامت کا قلع قمع کر دے۔

چنانچہ بالفعل ایسا ہی ہوا۔ پریس کے لیے قوانین نافذ ہوتے ہی سرزمین ترکی کے اندر لینن، مارکس اور دوسرے ائمہ ضلالت کی کتابوں کی بارش ہونے لگی۔ ان کتابوں نے خاص طور پر طلباء کے اندر بائیں بازو کے نظریات کا طوفان برپا کر دیا۔ ۱۹۶۴ء تک یہ عناصر اس قدر طاقتور ہو گئے کہ قریب قریب ترکی کی یونیورسٹیاں اُن کی گرفت میں آگئیں۔

(باقی)